بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح کوئی جہاز بے لنگر ہو کر سمندروں میں آوارہ تیرتا پھرتا ہے، یا کوئی شترِ بے مہار جس طرف چاہتا ہے رُخ کر لیتا ہے بالکل اسی طرح قومیں مقصد کی محبت سے محروم ہو کر گمراہیوں کے مختلف فتنوں کی نذر ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی ایک گمراہی کا سیلاب آیا تو وہ انہیں تنکوں کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اور کبھی کسی دوسری گمراہی کا غلغلہ بلند ہوا تو انہوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ جس طرح بے مقصد انسان دردر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے بالکل اسی طرح بے مقصد قومیں بدنصیبی کے دھکے کھاتی رہتی ہیں۔ آپ ذرا اپنی چشمِ تصور کے سامنے اس بدنصیب قافلے کو لائیے جس کی آنکھوں سے اُس کا نصب العین اوجھل ہو چکا ہو اور وہ اس بے بسی کے عالم میں ہر راہرو کے ساتھ چند قدم چلنے پر مجبور ہو۔ پھر ہر ایک کے ساتھ کچھ دُور چلنے کے بعد وہ مایوس ہو کر اس بنا پر اُس سے الگ ہونے کے لیے بیتاب ہو کہ یہ رہبر جس منزل کی طرف لیے جا رہا ہے یہ اُس کی منزل مقصود نہیں ہے۔ ایسا حرماں نصیب قافلہ اپنے اوقات، اپنی قوتوں اور اپنے مال کا جس طرح زیاں کر رہا ہو گا اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔

ہم اسے مسلم قوم کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی بدنصیبی سمجھتے ہیں کہ انسانوں کا وہ گروہ جسے انبیاء علیہم السلام کا وارث بنا کر پوری نوعِ بشری کی ہدایت کا فرض سونپا گیا تھا وہ آج خود اپنی منزل کھو دینے کی وجہ سے آوارہ و سرگرداں ہے اور انسانیت کے بھولے بھٹکے قافلوں کو راستہ دکھانے کے بجائے خود ان کے ساتھ گمراہی اور ضلالت کی مختلف وادیوں میں بھٹک رہا ہے۔ کبھی خدانا شناس

سائنس دانوں اور نیچریوں کے قافلے اس کی نظروں کو مفتوح کر لیتے ہیں۔ کبھی یہ امریت کے کاروانوں کے ساتھ ہم عنان ہو کر آگے بڑھنے لگتا ہے اور کبھی اشتراکیت کے جرس اسے مسحور کر کے اشتمالیت کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔

پھر اس مسلم قافلے کی مزید بد نصیبی یہ ہے کہ اپنے نصب العین کو نظر انداز کر کے یہ ایسے قافلوں کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھتا ہے جن کی منزل مقصود کسی صورت میں بھی اسلام نہیں ہوتی۔ لیکن خود اپنے آپ کو اور پوری نوعِ انسانی کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ان کی پیروی میں ضلالت کی راہ پر نہیں جا رہا ہے بلکہ حق و صداقت ہی کے راستے پر گامزن ہے۔ اُس کے اس کھلے ہوئے تضاد یا ابلہ فریبی پر جب کوئی گرفت کرتا ہے تو وہ بڑی تمکنت کے ساتھ کہتا ہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ اسلام کی حقیقی منزلِ مقصود کیا ہے۔ جس سمت یہ سارے کارواں رواں دواں ہیں وہی درحقیقت اسلام ہے۔ پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ان دونوں کے درمیان تو بُعد المشرقین ہے تو وہ برافروختہ ہو کر اور جھلّا کر کہتا ہے کہ سب کم ظرف ملّاؤں کی تنگ نظری اور تعصب کا نتیجہ ہے کہ وہ ملّی قافلے کی حرکت و حرارت کی صحیح طور پر قدر نہیں پہچانتے۔ اسلام بھی تو انہیں اسی منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے جس طرف کہ یہ قافلے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر اسلام کی ایسی عجیب و غریب تاویلات شروع ہو جاتی ہیں جن سے ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں کو رشد و ہدایت کی قندیلیں ثابت کیا جاتا ہے۔

آپ اگر گزشتہ ایک صدی کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دور میں اسلام سے زیادہ سیّال، اس سے زیادہ تغیر پذیر، اور اس سے زیادہ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اُڑ جانے والا کوئی نظریۂ حیات نہیں رہا۔ جب یورپ میں سرمایہ پرستی کا جنون بڑھا تو مسلمان ممالک میں سود کی حرمت کو حلت سے بدلنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ جب مغربی نظامِ فکر نے زور پکڑا تو دینی تعلیم فرسودہ قرار دی گئی، مغربی تعلیم کے چرچے ہونے شروع ہوئے اور اس سے جو نسل فیضیاب

ہو کر میدانِ عمل میں نکلی اُس نے خدا، وحی، الہام، رسالت، آخرت، غرض اسلام کے سارے اساسی تصورات میں ایسے تغیرات لانے کی کوشش کی کہ وہ مغربی افکار سے یکسر ہم آہنگ ہو جائیں۔ اس کے بعد یورپ میں قوم پرستی اور سیکولرزم کا دَور دورہ ہُوا تو مسلم قوم کے نادان دوستوں نے عالمگیر امتِ مسلمہ کے ٹکڑے کر کے قوم پرستانہ لادینی تحریکوں اور ریاستوں کو اپنا مسلک و نصب العین بنا لیا اور علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ ہماری اوّلین وفاداری اپنے وطن اور اپنی قوم سے ہے، مذہب کا تعلق بعد کی چیز ہے۔ پھر جب چند سال پیشتر چند قوموں کے سروں میں آمریت کا سودا سمایا اور انہوں نے پاگل پن کے عالم میں پوری دنیا کے امن کو برباد کیا تو مسلمانوں کے بہت سے نبضوں نے امت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسلام تو درحقیقت ڈکٹیٹر شپ کا ہی دوسرا نام ہے[1]۔ اب سرمایہ داری کی بعض لاینحل الجھنوں نے جب اشتراکیت کو جنم دیا اور اس نے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا تو امتِ مسلمہ کو بھی اسے بطور نصب العین اپنانے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ البتہ ہمیشہ کی طرح اس ضلالت و گمراہی پر بھی لفظ "اسلامی" کا اضافہ کر کے عوام الناس کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ وہ اُمت کو جس ڈگر پر ڈالنا چاہتے ہیں وہ تو عین شریعت کا اقتضاء ہے۔

---

[1] اس دور میں مسلمان ان آمرانہ تحریکات سے کس قدر مرعوب تھے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کے سلسلے میں بطور مثال ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔ میں اُن دنوں ایک ہائی اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ ہمارے دینیات کے معلّم جو بڑے نیک اور پاکباز تھے وہ ہر روز جماعت میں ہمیں یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے کہ ہٹلر اور مسولینی جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلام کے عین مطابق ہے اور امّت کی بگڑی اگر کسی طرح بن سکتی ہے تو وہ اس آمرانہ نظام کو اپنا کر ہی بن سکتی ہے۔ انہوں نے از راہِ عنایت مجھے ہٹلر کی مشہور تصنیف "میری جد و جہد" پڑھنے کے لیے بھی دی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے حواشی پر جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات درج کر رکھی تھیں۔

اسلامی سوشلزم کا موضوع دَورِ حاضر کے متجددین کا بڑا دلپسند مشغلہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے چونکہ بندہ مزدور کے، خصوصاً اس مزدور کے جس کا تعلق مشرقی ممالک سے ہے، اوقات محنت تلخ کردیئے ہیں، اس لیے اسلام میں رخنے ڈالنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ اب جبکہ عوام کے احساسات بڑے نازک ہیں اور وہ معاشی اعتبار سے بڑے بدحال ہیں، تو انہیں یہ بات سمجھائی جائے کہ جس دین کی وجہ سے تم اشتراکیت سے بدظن ہو، اشتراکیت تو معاشی لحاظ سے اسی دین کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ سرمایہ پرستی کے حامی اور رجعت پسند علماء نے اس دین مارکسی کو تمہارے لیے خواہ مخواہ ہوّا بنا دیا ہے ورنہ یہ دین اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام ہی ہے۔ البتہ تمہیں اس امر کا یقین دلانے کے لیے کہ ہم اشتراکیت کے ساتھ ساتھ اسلام کا دامن بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، ہم تمہارے لیے اسلامی اشتراکیت کا نظام تجویز کرتے ہیں۔

اسلامی اشتراکیت کا غلغلہ چونکہ اب کافی زور شور سے بلند کیا جارہا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور اشتراکیت کے مابین جو اساسی اور بنیادی فرق ہے اسے لوگوں کے ذہن نشین کردیا جائے، جو لوگ اس کے علمبردار ہیں ان کے اصل عزائم کی نشاندہی کی جائے اور اس سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دُور کیا جائے۔

تمام الہامی مذاہب کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر چار چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلے کسی مافوق الطبیعی ہستی پر جو اس کائنات کی خالق اور منتظم ہے، ایمان۔ دوسرے اُس کی طرف سے انسان کے رشد و ہدایت کے لیے انتظام پر یقین۔ تیسرے اپنے اچھے بُرے اعمال کی جزا و سزا کا احساس اور چوتھے انسان کے ایک ذی روح مخلوق ہونے کا عقیدہ۔

پہلے تین عقائد خالق و مالک کی ہستی سے تعلق رکھتے ہیں اور آخری عقیدہ اس کائنات میں انسان کا مرتبہ و مقام متشخص کرتا ہے۔ آپ اس عقیدے کا جتنا گہرا تجزیہ کریں گے اسی نسبت سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہوگی کہ انسان کے ایک ذی روح اور صاحبِ شعور ہستی ہونے کی بنا پر ہی اُس سے یہ

توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے، اس کی ہدایت کو سمجھ کر اُس کی پیروی کرے۔ پھر اُس علیم و خبیر ہستی کی رضا جوئی کے لیے ایک خاص اندازِ زندگی ترک کر کے ایک دوسرا طرزِ زندگی اختیار کرے اور اپنے اس عمل کے لیے اُس سے آخرت میں جزا کی امید رکھے

یہ خدا کو پہچاننے کا کام، اُس کی دی ہوئی ہدایت کی پیروی کرنے کا کام، پھر اُس کی خوشنودی کی خاطر اپنے آپ پر بعض پابندیاں لگانے اور بعض مصائب برداشت کرنے کا کام، اور اپنے کیے کی جزا اور سزا پر یقین۔ اس بات کی واضح شہادت ہے کہ انسان کو اگرچہ پیدا تو ایک معاشرے ہی میں کیا جاتا ہے مگر اسے ایک الگ روح اور شخصیت دیکر دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ وہ ابنائے نوع کے ساتھ مل کر جتنے کام بھی کرتا ہے ان میں اکثر اگرچہ اجتماعی نوعیت کے ہوتے ہیں مگر اُسے آخرت میں ایک فرد کی حیثیت سے ہی اپنے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس کے اعمال الگ تولے جائیں گے اور اُسی کے مطابق آخرت میں اُس کے مقام کا فیصلہ ہوگا۔ قرآن مجید میں وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ایک بڑا معنی خیز ارشاد ہے جو انسان کی انفرادیت اور اس کے احترام کی صراحت کرتا ہے۔ انسان کی انفرادیت، اُس کی دوسروں سے الگ شخصیت اور اس کا اپنی الگ روح کے ساتھ زندگی گزارنا وہ اساس ہے جس پر مذہبی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے چنانچہ دیکھیے، جن قوموں نے انسان کے بارے میں اس تصور کو نظر انداز کر کے انسان کو محض درخت کا ایک پتہ سمجھا انہیں لامحالہ آخرت اور اُس کی جزا و سزا سے انکار کرنا پڑا۔ انسان جب یہ سمجھ لے کہ اُس کی اپنی الگ کوئی روحانی حیثیت نہیں بلکہ وہ اجتماعیت کی مشین کا محض ایک پُرزہ ہے، اور اس کا وجود اجتماعی مفادات کی تکمیل ہی کے لیے ہے، تو پھر اس کو خدا خوفی اور آخرت کی جواب دہی سے کہیں زیادہ اس معاشرے کے مفادات کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے جس کا وہ فرد ہے اور وہ صرف انہی کاموں میں دلچسپی لینے لگتا ہے جو اجتماعیت کو تقویت پہنچا سکیں۔ ایسے لوگوں کے ہاں نیکی اور بدی کے تصورات بدل جاتے ہیں۔ نیکی پھر اُن کے نزدیک وہ عمل نہیں رہتی جسے اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ

قرار دیا ہو، بلکہ وہ فعل بن جاتی ہے جو اجتماعی نقطۂ نظر سے سُود مند ہو۔ اگر معاشرہ ڈسپلن سکھلانے کے لیے نماز کو مفید سمجھے تو نماز کی ادائیگی محمود فعل ہے، لیکن اگر اس کا فیصلہ یہ ہو کہ ان اوقات کو صنعتی اور زرعی ترقی کے لیے صرف کرنا زیادہ مفید ہے تو پھر نماز ایک گناہ اور وقت کا زیاں ہے اور صنعتی ترقی کے لیے کوشش عین عبادت اور نیکی ہے۔ معاملہ اسی حد پر نہیں رکتا۔ جب انسانوں کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ اصل چیز اجتماعیت ہے، اجتماعی مفادات کا حصول ہی اصل مقصود و مطلوب ہے، اجتماعی کوششیں ہی اصل عبادت ہیں، اور ان کے نتیجے میں جو کچھ ملے وہی آخرت کا ثمرہ ہے تو پھر حیات بعد الموت کا عقیدہ بھی محض بے معنی ہو جاتا ہے جسے تکلفاً کچھ مدت ساتھ لیکر چلا بھی جائے تو زیادہ دیر تک وہ ٹھیر نہیں سکتا۔ دنیا کی خفیٰ قوموں نے انسان کی روح اور اس کی انفرادیت سے انکار کیا اور اسے اجتماعیت کے سمندر کا محض ایک قطرہ خیال کیا جس کا کام ہی موجوں کے ساتھ بہنا ہے، انہوں نے آخرت کے تصورِ جزا و سزا کا بھی لازماً ابطال کیا ہے۔

دُور نہ جائیے، اپنے ہاں ہی دیکھ لیجیے کہ جو لوگ اجتماعی مفادات کو کسی عمل کے لیے اخلاق کی سب سے بڑی بنیاد سمجھتے ہیں وہ آخرت کے اُس تصوّر کے منکر ہیں جو ہمیں اسلام نے دیا ہے۔ اُن کے نزدیک جنت و دوزخ اسی دنیا میں ہیں۔ قوم کی اجتماعی جدوجہد جب بار آور ہو کر قوم کے لیے خوشحالی پیدا کرتی ہے تو وہ جنت ہے، اور جب وہ ہاتھ توڑ کر بیٹھ جاتی ہے اور اسے بدحالی سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ درحقیقت خود بھی دوزخ کی آگ میں جلتی ہے اور آنے والی نسلوں کو بھی اس میں جھونک دیتی ہے۔

آخرت اور جنت و دوزخ کا یہ تصوّر ایک محدود سے مغرب زدہ طبقے کو خواہ کتنا ہی متأثر کرے لیکن ایک مسلمان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اُس اساسی تصوّر کے خلاف ہے جو اُسے عقیدۂ آخرت کی صورت میں اسلام نے دیا ہے۔ دینِ حق نے اُس کے ذہن میں جو خیال بٹھایا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اعمال و افعال کا وزن مادّی باٹوں اور ترازوؤں سے متعین نہیں ہوتا۔ باری تعالیٰ

کی نظر میں اعمال کی اصل اہمیت اُن کے محسوس ثمرات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اُن کے اخلاقی اور روحانی پہلو سے ہے۔ آخرت کے دن اُن کی قدر و قیمت کا فیصلہ اجتماعی مقصودوں کی تکمیل کے تحت نہیں ہوگا بلکہ ہر شخص کا فیصلہ اس کے ایک ایک فعل کو اس کی نیت اور اس کے اخلاقی محرکات کے لحاظ سے جانچ کر کیا جائے گا۔ اور وہاں جواب دہی سوسائٹی یا معاشرے کو نہیں بلکہ فرد کو کرنی ہوگی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مادّی زندگی کے اجتماعی ثمرات ہی اصل جزا اور اجتماعی محرومی ہی اصل سزا ہے تو پھر قرآن مجید میں جو یہ ارشادات فرمائے گئے ہیں کہ قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک اس کے پاس تنہا تنہا حاضر ہوگا (مریم، ۹۵) اور جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی وہ اُسے دیکھ لیگا (الزلزال - ۸،۷) یہ سب بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرد اور اس کے حقوق کے تحفظ اور اس کے بحیثیت انسان کے احترام اور اس کے قول و فعل کی انفرادی ذمہ داری اور اس پر جزا و سزا، یہ سب تصورات جو دین کے مسلّمات ہیں اُسی صورت میں بامقصد ہو سکتے ہیں جب یہ تسلیم کیا جائے کہ اصل اہمیت فرد اور اُس کی شخصیت کو حاصل ہے اور اُس کے افعال و اعمال کا فیصلہ بھی آخرت میں بحیثیتِ فرد ہی کیا جائے گا۔ ورنہ اس بنیادی حقیقت کا انکار کر کے اگر یہ باور کر لیا جائے کہ اصل چیز اجتماعیت اور اُس کے مفادات ہیں اور اعمال کی جو کچھ اہمیت ہے وہ ان اجتماعی مفادات کے حصول کے لیے کوشش اور اُس کے ثمرات کی بنا پر ہے تو پھر کسی فرد کی نیکی، اُس کی آخرت میں باز پُرس، اس کا اپنے خالق و مالک سے ذاتی تعلق، اور اُس کے اپنے مستقل حقوق، یہ سب تصورات محض وہم و خیال بن کر رہ جاتے ہیں۔

لوگ عام طور پر یہ پوچھتے ہیں کہ مذہب نے فرد کو اس کائنات میں بحیثیت فرد اتنی اہمیت کیوں دی ہے۔ اس کا جواب بڑا سادہ اور آسان ہے۔ اگر فرد کو خدا سے بحیثیت فرد تعلق نہ رہے اور وہ اپنے اچھے بُرے اعمال کا خود ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے اور اسے اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ اُس کے نیک اعمال کبھی ضائع نہیں جائیں گے اور اس کی بد اعمالیاں کبھی گرفت سے بچ نہ

سکیں گی تو اُس کے اندر مذہبی اور روحانی احساس پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایک نیک اور خدا ترس آدمی کو زندگی میں کس قسم کی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس سے دنیا کبھی بے خبر نہیں ہوئی۔ اُسے راہِ خدا میں ستایا جاتا ہے، اس پر عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔ اس کے مقدس عزائم کی ہر طرف سے تضحیک ہوتی ہے اور اس کے پاکیزہ ارادوں کی تکمیل میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ وہ آدمی بظاہر بالکل ناکام و نامراد نظر آتا ہے لیکن وہ صداقت کے راستے پر گامزن رہتا ہے۔ اس کے اندر نہ تو جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور نہ انسانیت کے خلاف غیظ و غضب۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر کام کرتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ اُسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ میرے یہ اعمال دنیا کی نظروں میں خواہ کتنے ہی بے وزن ہوں مگر وہ آخرت میں عند اللہ ماجور ہوں گے۔ اسی طرح وہ بُرائی سے اس لیے باز نہیں رہتا کہ اُسے پولیس اور فوج کا ڈر ہے کیونکہ اگر یہی ڈر اس کے عمل کا محرک ہو تو اُس کے سامنے لاتعداد جرائم کے ارتکاب کے لیے ایسے کھلے اور وسیع میدان موجود ہیں جہاں نہ تو قانون کا ہاتھ پہنچتا ہے اور نہ معاشرے کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اُن کے ارتکاب سے باز رہتا ہے کیونکہ اُسے اس بات کا یقین ہے کہ اُس کے افعال و اعمال خواہ انسانوں کی نظر سے کتنے ہی اوجھل اور مستور ہوں مگر اُس علیم و خبیر ہستی سے چھپے نہیں رہ سکتے جس نے پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ باری تعالیٰ کے ساتھ یہ ذاتی تعلق اور اپنے ذاتی اعمال کے معاملے میں اُس سے اجر کی امید اور اس کی سزا کا خوف، یہ مذہب کی اساس اور بنیاد ہے۔ اگر یہ عقائد انسان کے دل و دماغ میں اچھی طرح پیوست نہ ہوں تو انسان کی زندگی میں کوئی مذہبی احساس باقی نہیں رہتا اور وہ اس شیریں عنصر سے خالی ہو جاتی ہے جس میں انسان سارے دکھ درد رواقیوں کی سی بے حسی کے ساتھ نہیں بلکہ پورے اطمینانِ قلب اور سکونِ خاطر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔

پروفیسر آرنلڈ جے۔ ٹائن بی نے اپنی ایک تصنیف میں یہ بڑی فکر انگیز بات لکھی ہے کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ایک فرد صرف معاشرے کے لیے زندہ ہے اور اس سے الگ اس کا کوئی وجود ہی نہیں اور اس کی جد و جہد اگر اجتماعی مفادات کے لیے وقف نہیں تو وہ بیکار ہے، تو آپ درحقیقت انسان

اور خدا کے تعلق کی نفی کرتے ہیں۔ ان حالات میں خدا کا نام یا اس کا تصور محض ایک اضافی سی چیز بن کر رہ جاتا ہے

الہامی مذاہب کے مقابلے میں مادیت نے انسان کے بارے میں جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی مستقل اور الگ کوئی حیثیت نہیں، اور اس بنا پر وہ اپنے لیے کسی مستقل حق کا بھی دعویدار نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے وجود کے لیے اجتماعیت کا رہینِ منت ہے۔ اُسے معاشرے کے لیے زندہ رہنا اور معاشرے ہی کے لیے مرنا ہے۔ اس کا کوئی ایسا عمل قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جو اجتماعی مفاد کے لیے مفید نہ ہو۔ اس کی ساری وابستگیاں صرف اجتماعیت سے ہیں۔ وہ اجتماعیت کا ویسا ہی ایک جُز ہے جیسے مشین کے کل پُرزے اس کے اجزا ہوتے ہیں۔ جس طرح مشین کا کوئی پُرزہ مشین سے الگ اپنی کوئی مستقل شخصیت نہیں رکھتا اسی طرح اجتماع کا کوئی فرد بھی اجتماع سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنی کوئی الگ شخصیت نہیں رکھتا جس کے اپنے کچھ مستقل تقاضے ہوں اور جس کے آزادانہ عمل کے لیے اجتماعی زندگی میں کوئی جگہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں انسان کا کوئی عمل اگر اپنے اندر کوئی معنویت رکھتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ وہ معاشرے کے اجتماعی مفاد کے نقطۂ نظر سے کوئی وزن رکھتا ہے

اس نقطۂ نظر کے حامیوں کے نزدیک، مذہبی نقطۂ نظر کے برعکس، ایک فرد کی اول و آخر وفاداری معاشرے سے ہے، خالق و مالک سے تعلق ایک اضافی چیز ہے جس کے لیے اجتماعی زندگی میں کوئی گنجائش چھوڑنا یا نہ چھوڑنا، اور کتنی گنجائش چھوڑنا، بالکل اجتماع کی مرضی پر منحصر ہے، کیونکہ اجتماعی مفادات دوسری ہر نوعیت کے تقاضوں سے زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ پسندیدہ عمل، جسے کوئی نیکی کہنا چاہے تو کہہ لے، بس وہ عمل ہے جو ان مفادات کے حصول کے لیے مفید ہو اور کوئی مستحسن اخلاق اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اجتماعی فوائد کے لیے کارآمد ہو۔ زبان سے ممکن ہے کہ یہ حضرات اس بات کو صاف صاف تسلیم کرتے میں متامل ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک معاشرہ ان کا خدا، اُس کے مفادات اُن کا ایمان، ان مفادات کے لیے تگ و دو ان کا عمل صالح، اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مادی فائدے ان کی جزا ہیں۔ ایسے معاشرے میں خدا کا تصور ایک

تکلف سے زیادہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ جب ایک آدمی یہ فرض کرلے کہ وہ معاشرے کے لیے زندہ ہے اور اُس کی مادی فلاح ہی اس کا کعبۂ مقصود ہے تو وہ لامحالہ کوئی روش اختیار کرتے ہوئے صرف یہ دیکھے گا کہ کیا اس سے وہ اجتماعی مقصد حاصل ہوسکتا ہے جو اُس کے پیش نظر ہے۔ اِس سے اُس روحانی اخلاق کی تغلیط ہو جاتی ہے جو مذہب پیش کرتا ہے۔ یہاں باری تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے بجائے اجتماعی مفادات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پیشتر میں یہاں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بعض لوگ فرد کے مرتبہ اور مقام کی اس صراحت کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ سارے مذاہب نہ سہی، اسلام تو اجتماعیت پر بڑا زور دیتا ہے اور معاشرتی تقاضوں کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ بات مجھے بھی تسلیم ہے۔ لیکن اس طرح کے اعتراض کرنے والے غالباً اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی احکام بھی فرد کے روحانی اور اخلاقی نشوونما اور آخرت میں اس کی فلاح و کامرانی کے لیے ہیں۔ وہ مادہ پرستوں کی طرح اجتماعی مفادات کو، جو درحقیقت مادی مفادات ہی ہوتے ہیں، حیاتِ انسانی کا مطلوب و مقصود قرار نہیں دیتا بلکہ اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لیے ایسے پاکیزہ قوانین دیتا ہے جس میں ہر فرد انسانی روحانی اعتبار سے پوری طرح نشوونما پاسکے اور اس طرح وہ باری تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہو۔

مملکت سے بڑی اجتماعی قوت دنیا میں کونسی ہوسکتی ہے۔ اسلام نے اس کے مقصدِ وجود کی تصریح کرتے ہوئے بتایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج۔ ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن و حکومت عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

یہاں ہیئتِ اجتماعی کی غرض بھی جو کچھ بتائی گئی ہے وہ اخلاقی اور روحانی تربیت، بھلائی کا قیام

اور برائی کا استیصال ہے۔ مذہب کے اندر فرد کی حیثیت، اور اس کے مقابلے میں مادیت کے اندر فرد کے مرتبہ و مقام کو سمجھنے کے لیے آپ پھول اور اینٹ کی مثال پر غور کریں۔ ایک آدمی اٹھتا ہے اور وہ پھولوں کی کیاریاں تیار کرتا ہے، انہیں پانی دیتا ہے، اُن میں رنگا رنگ پھولوں کے پودے لگاتا ہے۔ ظاہر بات ہے اس کی یہ محنت محض ایک پھول کی صورت میں تو بارآور نہیں ہو گی۔ گلستان میں لاتعداد پھول کھلیں گے، ان پھولوں کا اپنے پودوں کے ساتھ گہرا ربط ہو گا، ان پودوں کی جڑیں انہیں خوراک بہم پہنچائیں گی۔ لیکن اس گلستان کے نظام کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظام کی پوری اجتماعیت ایک ایک پھول کے نشو و نما کے لیے ہے۔ دوسرے لفظوں میں پھولوں سے پودے اُگانے اور انہیں خوراک بہم پہنچانے کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ عمدہ پھولوں کے حصول کو اصل مقصد سمجھ کر گلستان کا پورا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ بالکل یہی صورت مذہب کے اندر ایک فرد کی ہے۔ انسان کو بلاشبہ اجتماعی زندگی کے عین منجدھار میں اتارا جاتا ہے، اُسے اپنی شخصیت کے نشو و نما کے لیے بہت سی معاشرتی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑتی ہیں، لیکن یہ سب ذمہ داریاں اور یہ ساری تگ و دو اس غرض کے لیے ہے کہ اس اجتماعی نظام میں رہنے والے انسانوں کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی و روحانی نشو و نما نصیب ہو۔ یہ ہے فی الحقیقت کسی اخلاقی نظام میں ایک فرد کی حیثیت۔

اس کے برعکس زندگی کا وہ نظام جو مادی نظریۂ حیات پر قائم ہو اُس میں فرد اینٹ یا پتھر کے ایک ٹکڑے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اصل مقصد اجتماعیت کے رفیع الشان محل کی تعمیر ہوتا ہے اور اس میں افراد کو جس طرح ضرورت ہو بلاتکلف استعمال کیا جاتا ہے۔ اجتماعیت کے معماروں کے ہاتھ میں فرد بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اُس بیچارے کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ اس کے اپنے کوئی مستقل حقوق نہیں ہوتے۔ یہ معمار اپنے منصوبے کے مطابق اُسے جس طرح چاہتے ہیں توڑ پھوڑ کر اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جس مقام پر چاہتے ہیں جوڑ دیتے ہیں، کیونکہ اجتماعیت

پرستوں کے نزدیک بھی انسان کے وجود کا اصلی اور حقیقی مقصد ہے۔

آپ پوری تاریخ انسانی پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فرد کے مرتبہ و مقام کے بارے میں ان دو مختلف نقطہائے نظر میں آویزش درحقیقت خدا پرستی اور مادہ پرستی کی کشمکش ہے۔ انسانیت کے وہ محسن، یعنی انبیا اور صلحا، جنہوں نے اُسے خدا پرستی کا سبق دیا تھا، انہوں نے اپنا سارا زور فرد کی روحانی اور اخلاقی نشوونما پر صرف کیا اور اُسے ایک مستقل شخصیت اور واجب الاحترام ہستی سمجھتے ہوئے معاشرے کو اس نہج پر ڈھالنے کی کوشش کی جس سے معاشرہ فرد کی روحانی ترقی میں حائل ہونے کے بجائے اُس میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہوتا کہ فرد اپنے خالق و مالک کی اطاعت کے سارے تقاضوں کو کما حقہ پورا کر کے آخرت میں فائز المرام ہو سکے۔

اس کے برعکس مادہ پرستوں نے انسان کو اینٹ اور روڑے سمجھ کر انہیں مادی مفادات کی بلند و بالا عمارات تعمیر کرنے میں صرف کیا۔ انہوں نے انسان کے لیے کسی مستقل حق اور کسی مستقل مرتبہ و مقام کو ماننے سے انکار کیا اور اجتماعی مفادات، جو درحقیقت ایک مخصوص طبقے کے مادی مفادات ہی تھے، اُن کی تکمیل کے لیے اُسے بطور آلۂ کار استعمال کیا۔ قرآن مجید میں فرعون کے طرزِ عمل کے بارے میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ[1] (القصص۔ ۴)، وہ انسان کے بارے میں اسی مادہ پرستانہ طرزِ عمل کا ترجمان ہے یعنی جس طبقے کو جس طرح چاہا زندہ رہنے دیا اور اس سے جس طرح فائدہ اٹھانا چاہا اٹھاتے رہے۔ وہ بیچارا اپنی شخصیت کے تحفظ، اپنی آزادی کے تحفظ اور اپنے انسانی حقوق کے تحفظ سے ہمیشہ محروم ہی رہا۔

---

[1] "اس نے ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔ اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔

یہ طرزِ عمل صرف فرعون کا ہی نہیں دنیا پرست قوموں کی انسان کے بارے میں یہی ایک مستقل روش رہی ہے۔ مگر یہ بھی تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ ان قوموں نے آج تک کبھی اپنے اس مادہ پرستانہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل اور ان کے نتائج اور عواقب کو بطورِ حقیقت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اور اس بنا پر انسانیت فکری اور عملی تضاد کا شکار رہی ہے۔ یوں تو اس تضاد کے بیشمار واقعات ہمیں گزشتہ اقوام، یعنی قوم عاد، ثمود، قومِ لوط اور بنی اسرائیل میں ملتے ہیں لیکن ہم اپنی بحث کا آغاز روم اور یونان سے کرتے ہیں، کیونکہ تہذیبِ جدید اسی پرانی مادہ پرستانہ تہذیب کی صدائے بازگشت ہے۔

ان تہذیبوں کی تحلیل و تنقید کرنے سے، اُن اجزاء کو نظر انداز کر دینے کے بعد جو اصل نہیں بلکہ فروعات و مظاہر ہیں اور جو عام انسانی تہذیبوں کے درمیان مشترک ہیں، ان کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے جس کی مندرجہ ذیل خصوصیات نمایاں ہیں:

- غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔
- خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی۔
- دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد و لذائذ کا شدید اہتمام۔
- حُبِ وطن میں افراط و غلو۔

ہم ان متعدد اجزا اور پہلوؤں کو اگر ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا مادیت کا لفظ کافی ہے۔ مالک الملک سے انفرادی تعلق مفقود ہونے کی وجہ سے یونانیوں کے سامنے دو بڑے اہم سوال تھے۔ ایک یہ کہ اُن کے اعمال کے محرکات کیا ہوں، اور دوسرے ان اعمال کی نوعیت کا فیصلہ کرنے کے لیے پیمانے اور معیار کونسے ہونے چاہییں۔ کوئی الہامی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے مادّی فوائد کا حصول عمل کے محرکات قرار پائے اور اجتماعی مفادات کو اچھے بُرے اعمال کا معیار سمجھ لیا گیا۔

چونکہ انسان کا اپنے خالق و مالک سے کوئی مضبوط رابطہ نہ رہا تھا اس لیے معاشرے کو خدا کی جگہ دے کر اُس سے عبودیت کا تعلق قائم کیا گیا۔ یونانیوں نے اس ذہن کے ساتھ زندہ رہنے کے

انداز سیکھے کہ انہیں اجتماعی مفادات کے لیے زندہ رہنا اور ان ہی کے لیے مرنا ہے پھر انہیں یہ بھی مصیبت پیش آئی کہ اُن کے پاس کوئی ایسا روحانی ضابطۂ اخلاق کا نہ تھا جو انہیں حیاتِ انسانی کی اعلیٰ و ارفع قدروں کا پابند بنا کر اُن کی اجتماعیت کو قائم رکھتا۔ وہ آخرت کی جزا و سزا کے بھی قائل نہ تھے۔ اس وجہ سے انہیں کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر بھی آمادہ نہ کیا جا سکتا تھا جو اگرچہ دنیا میں بظاہر بار آور نہ ہو مگر اس دنیوی زندگی کی سرحد کو عبور کر کے انہیں آخرت میں اجر کا مستحق بنا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی داخلی زندگی روحانی سکون سے یکسر عاری اور خارجی زندگی نظم و ضبط سے یکسر محروم تھی۔ ان حالات میں اُن کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ معاشرے کو خالق و مالک سمجھ کر اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں اس طرح ڈال دیں جس طرح ایک بندۂ مومن اللہ کے حضور میں سرِ نیاز جھکا کر اسے یہ کہتا ہے کہ "میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں"۔

اس یونانی معاشرے میں اجتماعی تقاضے دوسرے سب تقاضوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ افلاطون کا یہ خیال تھا کہ شخصی ملکیت، خاندانی تعلقات اور ذاتی مفادات اجتماعیت کی فلاح کے راستے میں حائل ہوتے ہیں اس لیے ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ وہ شخصی ملکیت کو ختم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ گو اس معاملے میں اس کے نظریات میں کافی تضاد پایا جاتا ہے، کئی مقامات پر وہ شخصی ملکیت کا کسی حد تک قائل بھی نظر آتا ہے، لیکن اس کا نظریہ یہ ہے اگر کسی فرد کو جائداد حاصل ہوتی بھی ہے تو وہ معاشرے کی کرم فرمائی ہے اور اُسے لازمی طور پر معاشرے کے مفادات کے لیے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مفادات سے اُس کی مراد صرف مادی مفادات ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشِ دولت اور صرفِ دولت کے معاملے میں مملکت کو آخری اور فیصلہ کن حیثیت دیتا ہے۔

اس فلسفی کے ذہن پر اجتماعیت کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ خاندانی نظام کو بھی اس کے مفادات کے منافی سمجھتا ہے کیونکہ خاندان خود غرضی اور تعصب پیدا کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ عورتوں کو اجتماعی مفادات کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ کونسے مرد انہیں بہادر اور صحت مند بچے جنم دینے میں مدد دے سکتے ہیں، اور ایسے مردوں سے انہیں بلاکسی تکلف بلکہ جذبۂ افتخار کے ساتھ تمتع کرنا چاہیے۔ اس طرح جو نسل پیدا ہو گی وہ پہلی پوری نسل کو اپنا باپ سمجھے گی۔ مملکت کا دائرہ اس حد تک وسیع کر لینے کے بعد اور ایک فرد کو اس کے مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے کے بعد ایک چیز باقی رہ گئی تھی جو اس تہذیب کے علمبرداروں کے لیے سخت پریشان کن تھی اور وہ ضمیر اور روح کا اضطراب تھا۔ اس داخلی بے چینی سے یونانی عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے انہیں خارجی زندگی میں مختلف قسم کی دلچسپیاں مہیا کی گئیں۔ ڈرامہ، شاعری، مختلف قسم کے کھیل اور تہوار یونانیوں کے محبوب مشاغل تھے اور وہ ان سے خوب دل بہلاتے تھے۔

اشتراکیت یا دوسرے لفظوں میں اجتماعی مادیت کا یہی ورثہ روم کو ملا۔ اس میدان میں مسلسل اور طویل تجربات کے بعد اس بات کی پوری توقع تھی کہ مادی نظام حیات اشتراکیت کی صورت میں جلوہ گر ہو کر انسانیت کو بالکل ختم کر دیتا، لیکن اس ملک میں اچانک عیسائیت نمودار ہوئی۔ یہ دین اپنی اصلی قوت کھو دینے کی وجہ سے فکر و عمل کا کوئی عظیم انقلاب برپا کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس میں حق کے ساتھ باطل کی بھی بہت حد تک آمیزش ہو چکی تھی تاہم اس نے مادیت کے ہر آن بڑھتے ہوئے جنون اور اجتماعیت کی خدائی کے مقابلے میں انسانیت کی بے بسی اور بے کسی پر عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ انسان کی فطرت، جسے مادیت نے بالکل دبا رکھا تھا کسی حد تک بیدار ہوئی تو اس نے اپنے خالق اور مالک کو پہچاننے اور اس سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ شرک اور بت پرستی کی وجہ سے اہلِ روما خدائے واحد کے ساتھ وہ رشتۂ عبودیت تو استوار نہ کر سکے جس کا فی الحقیقت دینِ حق تقاضا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود خالق کے ساتھ معمولی سے تعلقِ خاطر نے بھی (باقی صفحہ ۱۸۱ پر)